چوبیسواں باب: سورۃ القیمۃ (آیات 4 تا 15)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1984ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ القیٰمۃ کی آیت 4 سے ہو رہا ہے: (75:4)

پچھلے درس میں' میں نے لفظِ لوامہ کے متعلق کچھ تشریح کی تھی۔ اگرچہ بات کچھ تھوڑی سی مشکل تھی لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ احباب نے اس میں بڑی دلچسپی لی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جسے ضمیر یا Conscience کہتے ہیں یا جسے نفسِ لوامہ کہہ کر پکارا گیا ہے وہ خدا کی طرف سے کوئی بنی بنائی چیز نہیں ملتی' اس کے اندر از خود یہ خصوصیت نہیں ہوتی کہ وہ شر اور خیر میں' غلط اور صحیح میں' امتیاز کر سکے۔ معاشرہ اس ضمیر یا نفسِ لوامہ کو مرتب کرتا ہے۔ جس قسم کا معاشرہ ہوتا ہے اسی قسم کا وہ ضمیر بن جاتا ہے۔

لفظ نفسِ لوامہ کے متعلق علامہ اقبالؒ کی وضاحت

علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے اس ساری تفسیر کو جو میں نے پچھلے پورے درس میں بیان کی تھی' دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے۔ ان کا تو انداز ہی فلسفیانہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ یاد رکھنے کے قابل ہے' پھر بات بھولے گی نہیں۔ انہوں نے اپنے خطبات میں یہ کہا ہے کہ یہ Conscience یا ضمیر یا لوامہ Internalized Society ہوتی ہے۔ یہ بڑا خوبصورت لفظ ہے یعنی معاشرہ ہے جو سینے کے اندر رسو یا ہوا ہو۔ بس یہ ہے جسے Conscience یا ضمیر کہتے ہیں۔

مجھے یاد آیا کہ پچھلے درس میں کہے گئے ایک شعر میں ذرا سا تسامح تھا۔ [1] میں نے کہا تھا "بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے" وہ ہے "بھٹک بھٹک کے کہاں آ گیا ہے دیوانے۔" اس میں بھی بڑا نفیس سا فرق ہے۔

---

[1] سہوِ غلطی

نوٹ: آیات 6 تا 13 کا درس بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے ریکارڈ نہ ہو سکا۔ مفہوم القرآن سے ان آیات کا مفہوم اس درس میں متعلقہ مقام پر شامل کیا جا رہا ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) لاہور (سالِ اشاعت درج نہیں ہے)، ص ص 1388-1387)

نفسِ لوامہ کے معنی کی بات ہو رہی تھی یعنی غلط بات پر کچھ ٹوکنے والی بات تھی۔ یہ اصل میں قانونِ مکافاتِ عمل ہے جو دین کی بنیاد ہے، جو قرآن کی ساری تعلیم کا ماحصل ہے۔ وہ قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ انسان کے ہر عمل، ارادے، خواہش اور آرزو تک اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہتے ہیں اور اس کے لیے یہ خصوصیت نہیں ہے کہ وہ نتیجہ اسی دنیا کے اندر مرتب کرے۔ قرآن کی رو سے چونکہ زندگی مسلسل چلتی ہے، اس لیے وہ اس کے بعد کی زندگی کے اندر بھی مرتب کرے گا۔ اصل چیز قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق اعتراض کیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں بھی کیا جاتا تھا، آج بھی کیا جاتا ہے کہ صاحب! یہ انسان مر جاتا ہے، وہ مردہ ہے، اس کی لاش ہوتی ہے، ہڈیاں گل سڑ جاتی ہیں اور اس کے بعد پھر اس کا دوبارہ زندہ کرنا کیسے ممکن ہے؟ قرآن لمبی چوڑی بحث میں نہیں پڑتا، بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتا ہے کہ تم اسے ناممکن سمجھتے ہو کہ جب ہڈیاں گل سڑ جائیں تو پھر دوبارہ اس کا زندہ ہونا کیسے ممکن ہوگا۔ یہ کہو کہ یہ ساری کائنات، خدا عدم سے، Nothingness (عدم) سے، وجود میں لایا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو اس میں سے یہ اتنی بڑی کائنات بن گئی تھی۔ تم خود بھی کچھ نہیں تھے اور یہ بن گئے۔ اگر وہ عدم جسے Nothingness کہتے ہیں، سے اتنی بڑی کائنات وجود میں لاتا ہے تو اس میں تو پھر بھی تم کہتے ہو کہ گل سڑ گئی، کچھ تو اس کا باقی ہوتا ہے، وہ اس سے کیوں دوبارہ وجود میں نہیں لا سکتا۔ یعنی وہ ان کے اعتراض کا جواب ہے اور یہ جواب بڑا عمدہ جواب ہے کہ یہ چیز ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ میں عرض کروں کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق قرآن نے تمثیلات میں بیان کیا ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس زندگی میں انسان یا فرد کس شکل میں پیدا ہوگا، اس کی کیسی صورت ہوگی، اس پہ قرآن بحث نہیں کرتا۔

انسانی اعمال کے نتیجہ میں جزا اور سزا کے الفاظ مناسب نہیں

عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ ہمارا اس چیز پر ایمان ہے کہ وہاں انسان زندہ ہوگا، یہ زندگی اور اس کے سارے واقعات اسے یاد ہوں گے، یہاں کے تمام اعمال کا اثر، اس کے نفس پر نقش ہوگا اور ان کے مطابق یہ متعین ہوگا کہ اس کی زندگی کس درجے پر پہنچتی ہے۔ اس کے لیے جزا اور سزا کے الفاظ بھی کچھ صحیح مفہوم کے متحمل نہیں ہوتے۔ وہاں انسان کی زندگی کے متعلق یہ متعین ہوگا کہ وہ کس درجے میں پہنچتی ہے کیونکہ قرآن نے پہلے یہ کہا تھا کہ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ❶ (74:37)۔ یہ بڑی بنیادی چیز ہے کہ ''جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے، جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔'' یہ تو ارتقائی منازل میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہنے کی ساری بات ہے۔ بہرحال اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہا جائے گا۔ قرآن نے کہا تھا کہ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ o

---

❶ یہاں ہر فیصلہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے۔ قوموں کی موت و حیات، افراد کا بڑھنا اور پیچھے رہ جانا، سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے سو جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویزؒ)

بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ❶ (75:3-4)۔ ''بنان'' انسان کی انگلیوں کو کہتے ہیں لیکن مجازی طور پہ یہ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے' جس سے کسی چیز کی گرفت ہو جس سے کسی چیز کو قابو میں لایا جائے۔ یہاں اس سے مراد انسان کی وہ قوتیں ہیں جس سے وہ کسی دوسرے عمل کو اپنے قابو میں لاتا ہے۔ اس آیت میں کہا ہے کہ ہمیں اس کی قدرت حاصل ہے کہ ہم اس کو پھر استوار کر دیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے بات تو یہ کہی ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی ایک برحق شے ہے اور یہ قانونِ مکافاتِ عمل کے لیے ضروری چیز ہے۔ کہا کہ یہ انسان جو اس قسم کے اعتراضات کرتا ہے کہ جس بنیاد پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے' وہ موت سے منتشر ہو جاتی ہے' موت کے بعد زندگی نہیں ہے' مکافاتِ عمل کا قانون نہیں ہے' یہ کیوں ایسا کرتا ہے؟ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (75:5) ❷ انسان' جس روش کی زندگی بسر کرتا چلا آ رہا ہے' وہ اس کا عادی ہو گیا ہوا ہے۔ لوٹ کے مال کا عادی ہو گیا ہے' ڈاکے کا چسکا پڑ گیا ہے' فریب کی کمائی کو سہل الحصول جان رہا ہے اور اس کی زندگی بڑے مزے اور عیش سے گزر رہی ہے۔ اصل میں وہ چاہتا یہ ہے کہ اس کی زندگی اسی طرح سے گزرتی جائے' اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔ یہ جسے آپ خدا کا پیغام' رسالت کی تلقین' قرآن کی تاکید' کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ وہ یہی ہے کہ جو لوگ غلط نہج کی زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں' انہیں روک دیا جائے کہ یہاں تک تو تم کر چکے' آگے نہ کرنا۔ یہ ہے اصل چیز اور یہی بات ان کو ناگوار گزرتی ہے یا ان کے فائدے میں نہیں ہے۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ جس انداز سے ہم زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں' اسی انداز سے باقی زندگی بھی گزارتے چلے جائیں۔ کہا کہ اصل وجہ یہ ہے۔ یہ اعتراضات تو Justificatory چیزیں ہیں' یونہی منطقی استدلال ہیں جن سے وہ یہ کہتے ہیں ورنہ اصل چیز یہی ہے کہ وہ یہی باقی زندگی بھی غیر ذمہ دارانہ انداز میں گزارنا چاہتے ہیں۔ اپنے غلط اعمال سے فرار کی خواہش لاشعوری طور پہ حیاتِ اُخروی کے تصور اور امکان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ دین کی بنیاد تو قانونِ مکافاتِ عمل کی ہے۔ اس لیے يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ (75:6) جب اس سے قیامت کے متعلق کہا جاتا ہے تو اس کے دل میں جھٹ اعتراضات ابھرنے لگتے ہیں'

---

❶ کیا انسان اپنے دل میں یہ خیال کیے بیٹھا ہے کہ جب وہ مر مرا کر ختم ہو جائے گا تو دوبارہ زندہ نہیں ہوگا؟ (36:78; 37:16) (اور اس طرح وہ اپنے غلط اعمال کی پاداش سے بچ جائے گا۔) کیا وہ سمجھتا ہے کہ جس بنیاد پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے' وہ موت سے منتشر ہو جاتی ہے اور پھر مجتمع نہیں ہو سکتی؟ یہ اس کا خیالِ خام ہے۔ ہمارے لیے ایسا کرنا کیا دشوار ہے؟ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے ان تمام قویٰ کو درست اور مکمل کر دیں جن سے اس کی زندگی قیام پذیر ہوتی ہے' اور اسے دوسری چیزوں کے تصرف پر گرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

❷ اصل یہ ہے کہ انسان حیاتِ اُخروی سے اس لیے انکار نہیں کرتا کہ وہ اسے ناممکن سمجھتا ہے۔ حیاتِ اُخروی پر یقین کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنا ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھائے۔ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے کوئی غلط کام نہ کرے لیکن انسان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے سے جی چراتا ہے۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ جس طرح اس کی سابقہ زندگی (یعنی جتنی زندگی وہ گزار چکا ہے) غیر ذمہ دارانہ گزری ہے' اسی طرح باقی زندگی بھی بے راہ روی میں گزر جائے۔ اپنے غلط اعمال کے نتائج سے فرار کی خواہش لاشعوری طور پر حیاتِ اُخروی کے تصور اور امکان کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے۔ (ایضاً)

اور وہ پوچھتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ قیامت کب آئے گی؟ یہ کس قدر خوفزدہی ہے!

اب سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے اعمال کے نتائج سے اس لیے بچ جائے گا کہ وہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں رکھتا؟ وہ ایمان رکھے یا نہ رکھے' وہ قانون اپنا کام کرتا رہے گا۔ مرنے کے بعد کی زندگی ہوگی اور اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آ کر رہیں گے خواہ یہ اس حقیقت سے کتنا ہی انکار کیوں نہ کرے۔ باقی رہا یہ کہ قیامت کب آئے گی' تو اس کا علم تو صرف خدا ہی کو ہے لیکن فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (75:7) جب وہ آئے گی تو حالت یہ ہوگی کہ مارے حیرت کے آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔

عزیزانِ من! یاد رہے کہ ایک قیامت اس دنیا میں بھی سامنے آجاتی ہے جب اعمال کے نتائج کا ظہور یہاں ہوتا ہے۔ اور ایک قیامت مرنے کے بعد واقع ہوتی ہے جس میں وہاں ظہورِ نتائج ہوتا ہے۔ یہاں کی قیامت بالعموم قوموں یا مختلف نظامہائے حیات کے باہمی تصادم کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ جب یہ تصادم یہاں ہوگا تو ان مخالفین کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اس وقت حالت یہ ہوگی کہ وَخَسَفَ الْقَمَرُ (75:8) چاند تاریک ہو جائے گا۔ یعنی جاہلیت عرب کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے اور یہ چیز کئی دفعہ درسوں میں بھی آچکی ہے کہ جاہلیت عرب کے جھنڈے کا نشان قمر تھا اور ایرانی سلطنت کے جھنڈے کا نشان شمس۔ اس لیے کہا کہ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (75:9) "چاند" اور "سورج" اکٹھے ہو جائیں گے۔ یعنی عرب اور ایران کی قوتیں مل کر ایک ہو جائیں گی۔ ان آیات میں اگر اس دنیا کی قیامت صغریٰ کی طرف اشارہ ہے تو اس سے مراد وہ انقلاب ہے جو ظہورِ اسلام سے عرب جاہلیت اور ایران کی سیاسی زندگی میں آنے والا تھا۔ ظہورِ نتائج کے وقت' خواہ وہ اس دنیا میں ہو یا آخرت میں' قرآن کہتا ہے کہ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ o کَلَّا لَا وَزَرَ (75:10-11) انسان انتہائی پریشانی کے عالم میں کہے گا کہ اب میں کدھر بھاگوں اور کہاں پناہ لوں؟ اس وقت کوئی ایسی جگہ نہیں ہوگی جہاں بھاگ کر پناہ لی جائے۔

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ دین کی بنیاد تو قانونِ مکافاتِ عمل کی ہے۔ کہا کہ اِلٰی رَبِّکَ یَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ (75:12) اُس دن انسان کے اگلے پچھلے تمام اعمال کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ اس لیے کہا کہ سوچو کہ بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ (82:9) تم اس خدا کے قانونِ مکافات کو جھٹلاتے ہو؟ لیکن تمہارے جھٹلانے سے کیا ہوتا ہے؟ کیونکہ اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ o کِرَامًا کَاتِبِیْنَ o یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (82:10-12) اُس نے تم پر نہایت معزز اور ایماندار محافظ مقرر کر رکھے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو انہیں اس سب کا علم ہوتا ہے۔ وہ اسے ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ اسے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔ اب یہاں کراماً کاتبین کے الفاظ آئے اور اس کے ساتھ ہی ان کا ایک مروجہ تصور ذہنوں میں آ گیا۔

کراماً کاتبین کی حقیقت

عزیزانِ من! اب ہمارے ہاں جو کراماً کاتبین کا تصور ہے وہ اس بات کو سمجھانے کے لیے تو ٹھیک ہے کہ وہ انسان کی ہر چیز کو لکھتے

رہتے ہیں۔ وہ جو ان کا نوشتہ ہوتا ہے، اسے اعمال نامہ کہتے ہیں۔ اس اعمال نامے میں انسان کا ہر عمل درج ہوتا ہے۔ اس کے مطابق ہی اس کی جزا اور سزا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ سمجھنے کے لیے تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن قرآن کا انداز اور اسلوب بیان ایسا ہے کہ وہ ہر سطح کے انسان کو بات سمجھا دیتا ہے۔ بات تو یہ ہے کہ کسی کا کوئی عمل ضائع نہیں جائے گا، ریکارڈ کیا جائے گا، محفوظ کیا جائے گا، اس کا نتیجہ مرتب ہوگا۔ البتہ عوام کو سمجھانے کے لیے یہی بات صحیح ہے کہ وہ جو لکھنے والے فرشتے ہیں وہ لکھیں گے۔ بات یہ پہنچانی ہے کہ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ تمہارا ہر عمل نتیجہ پیدا کرے گا۔ یاد رکھو! غلط بات کی سزا ملے گی۔ ۔ تدبر میں جو اونچی سطح کے لوگ ہیں، ان کے لیے قرآن اپنا انداز اختیار کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ o وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ [1] (75:14-15)۔ آج انسان کی کیفیت یہ ہے کہ جب غلط کار سے غلط کار انسان سے بھی پوچھا جائے کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ تو وہ اپنے جواز میں Justificatory Reason (وجہ جواز) دیتا ہے۔ اپنی تائید میں، اپنے حق میں، عجیب عجیب قسم کے دلائل دیتا ہے۔ واقعی بڑے سے بڑے مجرم سے بھی آپ بات کر کے پوچھیے اور کہیے کہ یہ کیوں کیا؟ وہ بھی اپنے حق میں کچھ دلیلیں دیتا ہے، اپنے ایکشن (عمل) کو Justify کرتا ہے۔ یہاں کہا کہ آج تو تم یہ کر سکتے ہو کہ کوئی پوچھے کہ یہ غلط کام کیوں کیا ہے تو اس کے لیے Justification پیش کرنے شروع کرتے ہو، جواز کے دلائل پیش کرنے شروع کر دیتے ہو۔ آج اگر تم نے یہ کچھ بھی کیا تو اس وقت یہ چیزیں کام نہیں آئیں گی۔ جو باطل کے دلائل تم غلط کام کے جواز میں پیش کرتے ہو، وہاں یہ نہیں ہوگا۔ پھر وہاں کیا صورت ہوگی؟ عجیب چیز ہے جو قرآن بتاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ نہیں ہوگا کہ وہاں تمہارے متعلق کسی دوسرے کا لکھا ہوا ہوگا اور کوئی دوسرا اسے پڑھ کر سنائے گا، وہاں سے کوئی سزا ہوگی۔ یہ کچھ نہیں ہوگا وہاں تم خود یہ سب کچھ اپنے خلاف کہو گے، کوئی باہر سے نہیں آئے گا۔ عزیزان من! یہ بڑی اہم چیز ہے۔

انسان خود اپنے خلاف آپ گواہ ہوگا

انسان کے اعمال اور ان کی سزا کے متعلق میں سنکھیا کھانے کی مثال دیا کرتا ہوں کہ جو سنکھیا کھانے والا ہے اس کی سزا کے لیے کسی سپاہی کی تھانے کی عدالت کی جج کی، کسی جیل خانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس کی ہلاکت اس سنکھیے کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہے، اس کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان خود اپنے خلاف آپ گواہ ہوگا، اپنے خلاف شہادت دے گا یعنی خود انسان اپنے ہی خلاف۔ گویا قرآن کا اعمال کے متعلق ایسا انداز ہے کہ انسان اس قسم کے دلائل کی رو سے جو اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا کرتا ہے یا دوسرے کو

---

[1] اس کے لیے نہ کسی خارجی گواہ کی حاجت ہوگی نہ بیرونی ثبوت کی ضرورت۔ انسان اپنے خلاف خود آپ دلیل ہوگا۔ (اس کی ذات، جس پر اس کے ہر عمل کا اثر منقوش ہوتا چلا جاتا ہے، اس کا اعمال نامہ ہوگی۔) اس وقت تو اس کی عقل بہانہ ساز اس کے غلط اعمال کے جواز میں ہزار دلائل پیش کر دیتی ہے اور اس طرح حقیقت پر پردے ڈالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن اس وقت اس کے تمام اعمال بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے اور کسی قسم کا کوئی بہانہ کام نہ دے گا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

دھوکا دیتا ہے وہاں اس کی گنجائش نہیں رہے گی' قیامت میں بھی نہیں رہے گی اور جب قرآن کے مطابق صحیح معاشرہ قائم ہوگا' اس میں بھی اس کی گنجائش نہیں رہے گی۔ اول تو اس معاشرہ کے جو مومن افراد ہیں' وہ ایسا کریں گے ہی نہیں' وہ نہ اپنے آپ کو فریب دیں گے نہ دوسروں کو فریب دیں گے' اور اگر کہیں کوئی ایسے ہونگے بھی تو معاشرے میں قانون کا' انصاف کا نظام' اس قدر Perfect (مکمل) ہوگا کہ اس قسم کے جو باطل کے دلائل ہیں' وہ وہاں کام ہی نہیں دے سکیں گے' کارفرما ہی نہیں ہو سکیں گے۔ قرآن نے دوسرے مقام پہ جو اعمالنامے کے متعلق کہا ہے' وہ بڑا ہی حقیقت کشا' عبرت آموز ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل سترہویں سورۃ میں کہا ہے کہ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (17:13) بات سمجھانے کے لیے کہا ہے کہ "ہر انسان کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے۔"

انسان کا اعمال نامہ انسان کی گردن میں

عزیزانِ من! آج تو کاغذات کو دستاویزات کو محفوظ کرنے کے ہزار ہا انتظام نکل آئے ہیں۔ کاغذ لمبا ہوتا ہے اس کو یوں لپیٹ لیتے ہیں مگر اب وہ صورت نہیں ہوتی۔ یہ اسے دست آویز کہتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ لپٹے ہوئے میں تاگہ باندھ کر یا رسی باندھ کر تو لٹکا لیتے تھے کہ کہیں گم نہ ہو جائے۔ یہ دست آویز یعنی ہاتھ کے ساتھ لٹکایا ہوا ہے۔ Document کا ترجمہ بھی دستاویز اسی لیے ہو گیا کہ وہ لپیٹ کر لٹکایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ٹین کی کچھ نلکیاں سی بنی ہوئی ہوتی تھیں' جو بہت زیادہ قیمتی کاغذات ہوتے تھے' وہ ان کے اندر رکھے جاتے تھے۔ میرے اپنے بچپن میں یہ سارے ہمارے گھر میں تھے۔ یہ انداز تھا۔ محفوظ رکھنے کی کوئی اور صورت نہیں تھی۔ بہر حال وہ لپٹا ہوا ہوتا تھا' اس کو لٹکایا ہوا ہوتا تھا۔ کہا کہ ہر شخص کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (17:13) بس اتنا ہی ہوگا کہ آج وہ لپٹا ہوا ہے' ظہورِ نتائج کے وقت' اس کو یوں کھول دیا جائے گا۔

کسی گواہی کی ضرورت نہ ہوگی

کیا خوبصورت انداز ہے کہ اس کے گلے میں لپٹا ہوا ہوگا بس کھول دیا جائے گا یعنی اعمال کے نتائج کے ظہور کی جو بات ہے اس کو یوں بیان کیا ہے کہ اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے' اس لیے اس کی نگاہوں سے وہ چھپا ہوا ہے۔ یوں کھول دیا جائے گا اور کھولنے کے بعد اس سے کہا جائے گا کہ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ (17:14) خود اپنا اعمالنامہ پڑھ۔ کیا بات ہے! خود پڑھ' کوئی دوسرا نہیں کہ وہ چارج شیٹ دیکھ کر پڑھ کر سنائے۔ اپنا اعمالنامہ خود پڑھ اور پھر کہا کہ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (17:14) اس کے بعد تمہارے خلاف کسی دعویدار کو' کسی گواہ کو' کسی شہادت کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم خود اپنے خلاف گواہیاں دو گے' تم خود اپنے خلاف حساب کرنے کے لیے کافی ہو گے۔ اپنے اعمال کو خود ہی Justify کرو گے یعنی تم خود اپنے خلاف شہادت دو گے اور اپنے خلاف خود ہی مدعی

بن کر کھڑے ہو جاؤ گے' کہیں کسی اور کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ❶ یہ کتنا خوبصورت انداز ہے بتانے کا!

انسانوں کے نظامِ عدل کی خامیاں

یہ سارا کچھ' جو کچھ بھی ہے' انسان کے اپنے اندر کی چیز ہے۔ یہ باہر جو معاشرت کا نظام عدل ہوتا ہے' اس میں سارے باہر کے ہوتے ہیں' اسی لیے اس میں قدم قدم پر اس کا امکان ہوتا ہے کہ غلط فیصلہ ہو جائے' جو بے گناہ ہے اس کو سزا مل جائے' جو گنا ہگار ہے وہ چھوٹ جائے۔ گرفتار کرنے والا' گواہ' منصف' یہ سارے باہر کے ہوتے ہیں۔ اگر یہی چیز انسان کے اپنے اندر کی ہو تو پھر اس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی کہ کوئی بچ نکلے۔ تو یہ چیز ہے کہ ہر ایک کا اعمالنامہ اس کی گردن میں' دستاویز کی طرح لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ آج وہ رول کیا ہوا ہے' چھپا ہوا ہے' اس وقت کھول کر سامنے لایا جائے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ تم خود پڑھو اور پھر اپنے خلاف آپ گواہی دو۔ یہ ہے وہ انداز جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔

اگلی بات یہ ہے کہ قرآن جتنی چیزیں قیامت یا یومِ حساب کے متعلق کہتا ہے وہ اس دنیا میں بھی سامنے آ جائیں گے جب معاشرہ قرآن کے مطابق قائم ہوگا۔ اس میں یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کی تاریخ جیسی بھی ہے' اس میں بعض واقعات چمکتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ وہ نبی اکرم ﷺ اور عہدِ خلافتِ راشدہ (11-40 H / بمطابق 632-661AD) کے واقعات ہیں کہ مجرم سے کسی ایسی جگہ' کسی طرح سے' کوئی جرم سرزد ہو گیا' گناہ سرزد ہو گیا' جہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں تھا' وہ از خود بابِ خلافت میں آ گیا اور آ کر کہا کہ مجھ سے یہ جرم سرزد ہو گیا ہے' مجھے اس کی سزا دیجیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مقدمے کی رو سے بہر حال ضروری تھا کہ کوئی گواہ ہو' کوئی شاہد ہو یا اس قسم کی کوئی بھی چیز ہو تو وہ تو نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ میں خود اپنے خلاف گواہ ہوں میں آ رہا ہوں۔ اس کے لیے معلوم ہے کہ اس کی سزا موت ہو سکتی ہے۔ وہ بار بار اس کی تاکید کر رہا ہے' اس پر اصرار کر رہا ہے کہ مجھے سزا دیجیے۔ کیا یہ وہی بات نہیں ہے جو قرآن کہہ رہا ہے کہ اپنا اعمالنامہ خود پڑھ' اپنے خلاف خود گواہی دے' اپنا محاسبہ آپ کر۔

عزیزانِ من! اگر معاشرہ اس قسم کا قرآنی ہو تو اس میں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے ایمان ہے کہ میرا یہ عمل یا یہ جرم جو ہو چکا ہے یہ بغیر سزا کے نہیں رہے گا۔ یہ ایمان ہے جو آ کے کہہ رہا ہے کہ مجھے یہیں سزا دیجیے۔ قرآن نے یہ جو چیزیں کہی ہیں' ان پر ہمارا ایمان ہے کہ ایسا ہوگا' آخرت میں بھی جا کر ہوگا اور اس دنیا میں بھی ہوگا۔ جب اس القیٰمۃ کے بعد نیا معاشرہ قائم ہوگا' خدا کے قانون کے مطابق اس معاشرے میں یہ چیزیں پیدا ہوں گی۔

---

❶ ان نکات کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004' ص ص۔ 97-91۔

قرآنِ حکیم کا مفہوم متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک گزارش

عزیزانِ من! اس آیت کے بعد دو تین چار [1] آیتیں ہیں جن میں پھر تدبر کی ضرورت ہے۔ ان کے دو قسم کے مفہوم ہیں جو وہاں غور و فکر کرنے کے بعد سامنے آتے ہیں۔ الفاظ وہی ہوتے ہیں مگر ان کے معنی یا تو لغوی لیے جاتے ہیں یا مجازی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ الفاظ میں بھی، عربی زبان میں بھی، اور ہر زبان میں، یہ قاعدہ ہے کہ بعض الفاظ کے بعض معنی تو لغوی ہوتے ہیں جیسے ماء یا آب کے معنی پانی ہیں۔ یہ سیدھی سی بات ہے اور اس کے بعض معنی مجازی ہوتے ہیں کہ اس سے مفہوم یہ ہے۔ قرآن میں یہ انداز بھی ہے کیونکہ یہ عربی زبان کی کتاب ہے۔ عربی زبان کے اندر یہ Basic (بنیادی) چیز تھی۔ ان کے ہاں بڑے ہی مجازی معنی ہوا کرتے تھے۔ پھر دوسرے مقامات کو بھی ساتھ لینا ہوتا ہے۔ ان سب کو ملا کر اگر مجازی معنی لیے جائیں تو پھر یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس سے کیا مفہوم ہے۔ کچھ لوگ جو پہلے تھے وہ ان کے وہی لغوی معنی لیتے تھے اور ایک آیت کو وہیں لیتے تھے، اسی جگہ لیتے تھے اور وہاں سے سمجھتے تھے کہ اگر تو اس کا تعلق حقائق سے ہے تو پھر اس کا اثر زیادہ برا نہیں پھیلتا لیکن اگر احکام اور قانون سے ہے پھر اس قسم کے جو نتائج ہیں وہ بڑے مضرت رساں بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کافی ہے، ہماری ہدایت کے لیے، یہ مکمل ضابطہ ہدایت، ضابطۂ قوانین بھی ہے تو اس کے لیے بڑے ہی تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ خارج از قرآن تو کہیں سے مدد نہیں لی جائے گی، قرآن کے اندر سے یہ چیزیں ثابت ہوں گی تو اس کے لیے ان لوگوں کی ضرورت ہوگی جن کی قرآن پر بڑی وسیع نگاہ ہوگی۔ قرآن کے تمام مقامات بیک وقت سامنے آئیں، عربی زبان کی رو سے یہ معلوم ہو کہ ان الفاظ کے مجازی معنی کیا لیے جاتے تھے اور لغوی معنی کیا لیے جاتے تھے۔ اگر یہ ساری چیزیں سامنے ہوں، اس رو سے ان کا مفہوم لیا جائے تو قرآن کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو واضح نہ ہو جائے۔ میں نے اسی لیے آج یہ سب کچھ عرض کیا ہے۔

آج وقت ہو گیا ہے اور آگے جو چار آیتیں آ رہی ہیں، ان میں یہ دونوں چیزیں سامنے آئیں گی تو انہیں آئندہ درس پر اٹھا رکھتے ہیں۔ آج ایک اعلان کے بعد اس درس کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

●……●●●……●

---

[1] اس سورۃ کی 16 تا 19 آیات